جنوری ۱۹۰۳ء

خطبہ جمعۃ الوداع

(ایڈیٹر "الحکم" کے الفاظ میں)

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (البقرة:۱۳۱)

ان آیتوں میں، ان کلمات شریفہ میں اللہ تعالیٰ ایک شخص کی راہ پر چلنے کی ہدایت فرماتا ہے اور وہ انسان اس قسم کا ہے جس کو ہر مذہب و ملت کے لوگ عموماً یا غالباً عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ کون؟ ابوالانبیاء حنفاء کا باپ ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام۔ یہ ابراہیمؑ وہ ہے جس کی نسبت اس سے پہلے فرمایا۔ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (البقرة:۱۲۵) کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں کے بدلے انعام دینا چاہا تو اس نے ان کو پورا کر دکھایا۔

اللہ تعالیٰ جب انسان کو سچے علوم عطا کرتا ہے اور اس کا ان علوم کے مطابق عملدرآمد ہو پھر اس میں قوت مقناطیسی پیدا ہو جاتی ہے اور نیکیوں کا نمونہ ہو کر دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ درجہ اس کو تب ملتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا وفادار بندہ ہو اور اس کی فرمانبرداری میں ایسا ثابت قدم اور مستقل مزاج

ہو کہ رنج میں، راحت میں، عسر میں، یسر میں، باساء میں، ضراء میں، غرض ہر حالت میں قدم آگے بڑھانے والا ہو اور اللہ جل شانہ کی وفاداری میں چست ہو۔ اس کو حاجتیں پیش آتی ہیں مگر وہ اس کے ایمان کو ہر حال میں بڑھانے والی ہوتی ہیں کیونکہ بعض وقت حاجت پیش آتی ہے تو دعا کا دروازہ اس پر کھلتا ہے اور توجہ الی اللہ اور تضرع الی اللہ کے دروازے اس پر کھلتے ہیں اور اس طرح پر وہ حاجتیں مال و جان کی ہوں، عزت و آبرو کی ہوں، غرض دنیا کی ہوں یا دین کی، اس کے تقرب الی اللہ کا باعث ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ جب وہ دعائیں کرتا ہے اور ایک سوز و رقت اور دلگداز طبیعت سے باب اللہ پر گرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں کامیاب ہو جاتا ہے تو باب شکر اس پر کھلتا ہے اور پھر وہ سجدات شکر بجا لا کر ازدیاد نعمت کا وارث ہوتا ہے جو ثمرات شکر میں ہیں۔ اور اگر کسی وقت بظاہر ناکامی ہوتی ہے تو پھر صبر کے دروازے اس پر کھلتے ہیں اور رَضا بِالْقَضَاءِ کے ثمرات لینے کو تیار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ حاجتیں جب کسی بدبخت انسان کو آتی ہیں اور وہ مالی، جانی یا اور مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ حاجتیں اور بھی اس کی دوری اور مہجوری کا باعث ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ بے قرار مضطرب ہو کر قلق کرتا اور ناامید اور مایوس ہو کر مخلوق کے دروازہ پر گرتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے ایسا بیگانہ اور ناآشنا ہوتا ہے کہ ہر قسم کے فریب و دغا سے کام لینا چاہتا ہے۔ اگر کبھی کامیاب ہو جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ذکر اور اس کی حمد و ستائش کا موقع نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اپنی کرتوتوں اور فریب و دغا اور چالبازیوں کی تعریف کرتا اور شیخی اور تکبر میں ترقی کرتا اور اپنی حیل و تجاویز پر عجب و ناز کرتا ہے۔ اگر ناکام ہوتا ہے تو رَضا بِالْقَضَاءِ کے بدلے اس کی مقادیر کو کوستا اور بری نگاہ سے دیکھتا اور اپنے رب کا شکوہ کرتا ہے۔ غرض یہ حاجتیں تو سب کو ہیں اور انبیاء، اولیاء و صدیقوں اور تمام منعم علیہ گروہ کے لئے بھی مقدر ہوتی ہیں مگر سعید الفطرت کے لئے وہ تقرب الی اللہ کا باعث ہو جاتی اور اس کو مزید انعامات کا وارث بنا دیتی ہیں اور شقی مضطرب ہو کر قلق کرتا ہے اور ناکام ہو کر سُخط عَلَى اللّٰہ کر بیٹھتا ہے۔ کامیابی پر وہ مبتلائی الشرک ہو جاتا ہے اور ناکامی پر مایوس۔

مشکلات اور حوائج کیوں آتے ہیں؟ ان میں باریک در باریک مصالح الہیہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ مشکلات میں وسائط کا مہیا کرنا تو ضروری ہوتا ہے۔ اس سے پتہ لگ سکتا ہے کہ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً (النساء:۸۶) کا ثواب لینا بھی کیسی نعمت الٰہی ہے اور پھر ان میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ ان خدمات کے ثمرات، مساعی جمیلہ، ان کی فکر اور محنت پر اللہ تعالیٰ کو انعام دینا منظور ہوتا ہے اور اس طرح پر نہ سنن الٰہی باطل ہوتے ہیں اور نہ سلسلہ علم ظاہری کا باطل ہوتا ہے۔

غرض سچا اور پکا مومن وہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت امام نے شرائط بیعت میں لکھا ہے کہ رنج میں' راحت میں' عسر میں' یسر میں قدم آگے بڑھاوے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان امور کا پیش آنا ضروری ہے تو ہر ایک حالت میں فرمانبردار انسان کو چاہئے کہ ترقی کرتا رہے اور دعاؤں کی طرف توجہ کرے تا کامیابی کی راہیں اسے مل جائیں۔ اور یہ ساری باتیں ابراہیمی ملت کے اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

ابراہیمی ملت کیا ہے؟ یہی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا اَسْلِمْ تو فرمانبردار ہو جا۔ انہوں نے کچھ نہیں پوچھا' یہی کہا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ (البقرة:۱۳۲)۔

اسلام کسی دعوے کا نام نہیں۔ بلکہ اسلام یہ ہے کہ اپنی اصلاح کر کے سچا نمونہ ہو۔ صلح و آشتی سے کام لے۔ فرمانبردار ہو۔ سارے اعضا قلب' زبان' جوارح' اعمال و اموال انقیاد الٰہی میں لگ جائیں۔ منہ سے مسلمان کہلا لینا آسان ہے۔ شرک' حرص' طمع اور جھوٹ سے گریز نہیں۔ زنا' چوری' غفلت' کنبہ پروری اور ایذا رسانی سے دریغ نہیں۔ پھر کہتا ہے میں فرمانبردار ہوں۔ یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیسا عجیب زمانہ تھا جب یہ دعویٰ کہ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (البقرة:۱۴۰)' نَحْنُ لَهٗ عَابِدُوْنَ (البقرة:۱۳۹) علی رؤس الاشہاد کئے جاتے تھے۔ ایسے پاک مدعیوں کی طرح مومن بننا چاہئے جن کی تصدیق میں خدا نے بھی فرمایا کہ ہاں' سچ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے مخلص عابد ہیں۔ مومن کو اَسْلِمْ کہنے کے ساتھ ہی اَسْلَمْتُ کہنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہی نکتہ معرفت کا ہے جو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے' اور اسی کے نہ سمجھنے کی وجہ سے فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (المومن:۸۴) کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ . ت سے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم مدارج تحقیقات پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اس غلط خیال نے بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اسی سے مشرکوں نے استدلال کر لیا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (البقرة:۱۷۱)۔ غرض ایک راستباز کی شناخت کے لئے کبھی کوئی مشکل یہود یا نصاریٰ یا منکرین امام پر نہ آتی اگر وہ سمجھتے کہ پاک رسول نے کیا دعویٰ کیا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:۱۰) ان کو کہہ دو کہ میں نے کوئی نیا دعویٰ نہیں کیا۔ نئے رسول کے لئے مشکلات ہوتی ہیں لیکن جس سے پہلے اور رسول اور نواب اور ملوک اور راستباز گزر چکے ہیں اس کو کوئی مشکلات نہیں ہوتیں۔ جن ذرائع سے پہلے راستبازوں کو شناخت کیا ہے وہی ذریعے اس کی شناخت کے لئے کافی اور حجت ہیں۔ تعلیم میں مقابلہ کر لے۔ اس کا چال چلن دیکھ لے کہ پہلے راستبازوں جیسا ہے یا نہیں۔ دشمن کو دیکھ لے کہ اسی رنگ کے ہیں یا نہیں۔ آدمی کو ایک آسان راستہ

نظر آتا ہے۔ مگر خدا کے فضل سے مجھے محض اللہ ہی کے فضل سے اس آیت قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:۱۰) کے بعد راستباز کی شناخت میں کوئی مشکل نہیں پڑی۔ مگر بات یہ ہے کہ تعلیم الٰہی کے بغیر یہ سمجھ میں نہیں آسکتی اور تعلیم الٰہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون ٹھہرا دیا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (البقرہ:۲۸۳)۔

میں پھر کہتا ہوں کہ ملت ابراہیم بڑی عجیب راحت بخش چیز ہے۔ وہ ملت' وہ سیرت کیا ہے؟ اَسْلِمْ فرمانبردار ہو کر چلو۔ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ پھر اس ملت اور سیرت کو چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شفا بخش' رحمت اور نور پایا تھا اس لئے نہ صرف اپنے ہی لئے اس کو پسند کیا بلکہ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ (البقرہ:۱۳۳) اسی سیرت اور ملت کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو وصیت کی۔ ایک دانا انسان اولاد کے لئے کوئی ضرر رساں چیز نہیں چاہتا۔ مکانوں میں ان کے لئے مضبوطی' خوبصورتی اور دیگر لوازم کی کیسی سعی کرتا ہے اور کیوں؟ اولاد کی بہتری کے خیال سے یہ انسانی فطرت میں ہے کہ وہ اولاد کی بہتری چاہتا ہے۔ پھر ابراہیمؑ جیسا اولوالعزم انسان جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَلَّذِىْ وَفّٰۤى (النجم:۳۸) اس نے اپنی اولاد کے لئے کیا خواہش کی ہوگی؟ اور وہ خواہش اس وصیت ابراہیمی سے ملتی ہے اور اس دعا سے اس کا پتہ ملتا ہے جو انہوں نے کی رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (البقرہ:۱۳۰)۔ اس وصیت پر غور کر کے ہمیں اندازہ کرنا چاہئے کہ ہم اپنی اولاد کے لئے کیا خواہش کرتے اور کیا ارادہ رکھتے ہیں؟ الغرض یہی باتیں تھیں یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہونا اور اس کے احکام پر کاربند ہونا۔ اسی کی وصیت اپنی اولاد کو کی اور اس کے پوتے کے بیٹے کریم ابن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق کی بھی یہی ملت تھی۔ اب تم سب اپنے اندر ہی اندر سوچو کہ کیا خواہش اور ارادے ہیں۔

میں نے ایک شخص کو کہا کہ قرآن پڑھا کرو۔ اس نے کہا کہ میری شان کے موافق کوئی قرآن مجھے دیدو۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں اس نے قرآن پر خرچ کرنے سے مضائقہ کیا۔ علی العموم لوگ یہی چاہتے ہیں کہ قرآن مفت مل جاوے اور دیگر اخراجات میں خواہ کسی قدر بھی روپیہ خرچ کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں۔ دیکھو ہمارے امام کو الہام ہو چکا ہے اور میں اس پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ سورج کے ہوتے سورج کے وجود پر۔ وہ کہتا ہے کہ جن کی خواہش اور محبت قرآن کریم سے نہ ہوگی ان کی اولاد گندہ خراب وخستہ ہوگی۔ اب تم سب اپنی اپنی جگہ دیکھو کہ بیاہ شادی اور معاشرت کے وقت کیا کیا خواہشیں ہوتی ہیں۔ ایک طرف ان کو رکھو اور دوسری طرف اس

پیغام الٰہی پر غور کرو جو امام کی معرفت ملا ہے۔ پھر ابراہیمؑ کا پوتا یعقوبؑ اپنی اولاد کو مخاطب کر کے کہتا ہے یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ (البقرہ:۱۳۳) اے میری اولاد اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک دین برگزیدہ کیا ہے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (البقرہ:۱۳۳) پس تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تمہاری موت نہ آوے مگر ایسے رنگ میں کہ تم مسلمان ہو۔ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے ہو۔

انسان کو موت کا وقت معلوم نہیں اور پتہ نہیں اس وقت حواس درست ہوں یا نہ ہوں اور پھر یہ امر اختیاری نہیں' اس لئے یہ عقدہ کس طرح حل ہو؟ ایک صحیح حدیث نے اس مسئلہ میں میری رہنمائی کی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب عمل کرتا ہے تو فرشتے اس کے اعمال کو لکھتے جاتے ہیں' سعادت کے اعمال بھی اور شقاوت کے اعمال بھی اور موت کے قریب ان کی میزان کی جاتی ہے اور پھر وہ مقادیر الہیہ سبقت کرتی ہیں۔ اگر وہ لوگوں کی نظر میں نیک تھا' پر اللہ سے معاملہ صاف نہیں یا اللہ سے معاملہ صاف ہے مگر لوگوں کی نگاہ میں نہیں تو وہ کتاب باعث ہوتی ہے کہ اس کا خاتمہ اللہ کی رضا یا سخط پر جیسی صورت ہو' ہو۔ پس ہر روز اپنے اعمال کا محاسبہ چاہئے۔ ایک صحابی نے ہماری سرکار صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ جاہلیت میں میں نے کچھ صدقات کئے تھے۔ کیا وہ بابرکات ہوں گے؟ ارشاد ہوا کہ اَسْلَمْتَ مَا اَسْلَفْتَ یہ اسلام ان کی ہی برکت سے تجھے نصیب ہوا ہے۔ موت علی الاسلام اس طرح نصیب ہو سکتی ہے کہ انسان ہر روز محاسبہ کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف کرے۔ اگر تعلقات صحیحہ نہ ہوں تو توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَآءَ (البقرہ:۱۳۴) تم تو موجود تھے۔ تمہارے اسلاف گواہی دیتے ہیں کہ یعقوبؑ نے آخر وقت کیا ارشاد کیا' کس کی اطاعت کرو گے؟ انہوں نے کہا نَعْبُدُ اِلٰھَکَ (البقرہ:۱۳۴) ہم اللہ کے فرمانبردار ہوں گے جو تمہارا اور اسحاقؑ اور ابراہیمؑ کا معبود تھا اور وہ ایک ہی تھا۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ:۱۳۴) ہم ہمیشہ اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ پس یہ حق وصیت کا ہے اور تمام وعظوں کا عطر اور اصل مقصد یہی ہے جو تمہارے سامنے پیش کیا ہے اور یہ وصیت ہے اس شخص کی جو ابو الانبیاء اور ابو الحنفاء ہے۔

اور اسی کی وصیت کو میں نے تمہارے سامنے پیش کیا ہے۔ پس تم اپنے کھانے پینے' لباس' دوستی' محبت' رنج' راحت' عسر' یسر' افلاس' دولتمندی' صحت اور مرض' مقدمات و صلح میں اس اصول کو مدنظر رکھو کہ اللہ کی فرمانبرداری سے کوئی قدم باہر نہ ہو۔ پس یہ وصیت تمام وصیتوں کی ماں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے کہ ہر حال میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری مدنظر ہو۔ اور یہ ہو نہیں سکتی جب اللہ تعالیٰ سے بغاوت ہو۔ اور یہ بھی بغاوت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک کو بڑا بناتا ہے اور اس کو برگزیدہ کرتا

ہے مگر یہ اس کی مخالفت کرتا اور اس سے انکار کرتا ہے۔ برہموؤں نے اسی قسم کا دعویٰ کیا ہے جو وہ رسالت و نبوت کے منکر ہیں۔ یہ بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ مطاع ہو اور وہ گویا ارادہ الٰہی کا دشمن اور باغی ہے۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ:۶) کی دعا کرو۔ علوم پر ناز اور گھمنڈ نہ کرو۔ رنج میں، راحت میں اور عسر یسر میں قدم آگے بڑھاؤ۔

خطبہ ثانی

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النحل:۹۱)

اس آیت میں بڑے حکم ہیں۔ پہلا حکم عدل کا ہے۔ ایک عدل و انصاف بندوں کے ساتھ ہے۔ دیکھو ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہم سے دغا فریب کرے یا ہمارا نوکر ہو تو وہ ہماری خلاف ورزی کرے۔ پس ہم کو بھی لازم ہے کہ اگر ہم کسی کے ساتھ خادمانہ تعلق رکھتے ہیں تو اپنے مخدوم و محسن کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کریں اور کسی سے کسی قسم کا مکر و فریب اور دغا نہ کریں۔ یہی عدل ہے۔ ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔

یہ عدل باہم مخلوق کے ساتھ ہے۔ اور پھر جیسے ہم اپنے محسنوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو محسنوں کا محسن اور مربیوں کا مربی اور رب العالمین ہے اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں عدل کو ملحوظ رکھیں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور اس کا نِدّ اور مقابل تجویز نہ کریں۔

اس کے بعد دوسرا حکم احسان کا ہے۔ مخلوق کے ساتھ یہ کہ نیکی کے بدلے نیکی کرتے ہیں اس سے بڑھ کر سلوک کریں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان یہ ہے کہ عبادت کے وقت ہماری یہ حالت ہو کہ ہم گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور اگر اس مقام تک نہ پہنچے تو یقین ہو کہ وہ ہم کو دیکھتا ہے۔

پھر تیسرا حکم ایتاءِ ذی القربیٰ کا ہے۔ ذی القربیٰ کے ساتھ تعلق اور سلوک انسان کا فطری کام ہے جیسے ماں باپ بھائی بہن کے لئے اپنے دل میں جوش پاتا ہے اسی طرح اللہ کی فرمانبرداری میں متوالا ہو۔ کوئی غرض مدنظر نہ ہو۔ گویا محبت ذاتی کے طور پر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہو۔

پھر چوتھا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے ہر قسم کی بے حیائیوں' نافرمانیوں اور دوسرے کو دکھ دینے والی باتوں سے اور ان بغاوتوں سے جو اللہ جل شانہ یا حکام یا بزرگوں سے ہوں اور آخر میں یہ ہے يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اللہ تعالیٰ تمہیں وعظ کرتا ہے۔ غرض اور منشاء الٰہی یہ ہے کہ تم اس کو یاد رکھو۔ دو قسم کے واعظ ہوتے ہیں اور دو ہی قسم کے سننے والے۔ واعظ کی دو قسمیں تو یہ ہیں کہ کچھ پیسے مل جاویں اور یا مدح سرائی ہو کہ عمدہ بولنے والا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہارے وعظ میں یہ دونوں باتیں نہیں بلکہ وہ محض نصح کے لئے کہتا ہے جو کہتا ہے۔ اور سننے والوں میں سے ایک قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو اس وقت کچھ مزہ آتا ہے اور پھر یاد کچھ نہیں رہتا۔ دوسرے بالکل کورے کارے ہوتے ہیں۔ پس تم اس قسم کے سننے والے نہ بنو بلکہ وعظ کی اس غرض کو ملحوظ رکھو لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے۔ آمین

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ ---- ۱۷/ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱ تا ۱۳)

☆ ☆ ☆ ☆